حصّہ نثر

شاہد احمد دہلوی
(۱۹۰۶ء-۱۹۶۷ء)

شاہد احمد دہلوی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے پوتے اور مولوی بشیر الدین احمد کے فرزند تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے ایف سی کالج لاہور سے ایف ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا لیکن شدید بیمار ہوگئے چناں چہ طبّی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعد ازاں دہلی سے انگریزی ادبیات میں بی اے آنرز کیا۔ ایم اے فارسی کا امتحان بھی پاس کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد شاہد احمد دہلوی کراچی منتقل ہوگئے اور تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی ادب سے تراجم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پاکستان رائٹرز گِلڈ کی تشکیل میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۳ء میں انھیں مجموعی ادبی خدمات کی بنا پر تمغا برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

شاہد احمد دہلوی زبان و بیان پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ان کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ وہ موسیقار بھی تھے لیکن اردو ادب ہی ان کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مشورے پر انھوں نے خاکہ نگاری شروع کی۔ گنجینۂ گوہر (جس سے زیرِ نظر خاکہ لیا گیا ہے) اور بزمِ خوش نفساں ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی تصانیف میں اُجڑا دیار، دِلّی کی بپتا اور دھان کے کھیت شامل ہیں۔

مرزا محمد سعید

تدریسی مقاصد

۱۔ دِلّی کی تہذیب، خصوصاً مُتمَوّل طبقے کی معاشرت سے تعارف کرانا۔
۲۔ شاہد احمد دہلوی کی شُستہ اور بامحاورہ زبان کی خوبیوں سے طلبہ کو رُوشناس کرانا۔
۳۔ خاکہ نگاری کے اِس نمونے کے ذریعے سے طلبہ کو تحریک دینا کہ وہ مزید خاکوں کا مطالعہ کریں۔
۴۔ طلبہ پر واضح کرنا کہ اہلِ علم حلیم الطبع اور وضع دار ہوتے ہیں۔
۵۔ طلبہ کو علمی مجالس اور اہلِ دانش کے طور طریقوں سے رُوشناس کرانا۔
۶۔ نئے الفاظ اور تراکیب سے واقفیت دلانا۔
۷۔ خاکہ، جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ کا تعارف کرانا۔

صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا کہ پروفیسر مرزا محمد سعید کا آج سوئم ہے۔ خاموش زندگی! خاموش موت! مرزا صاحب کی علالتِ مزاج یا مرض الموت کی اطلاع اس سے پہلے کہیں سے نہیں ملی۔ حد یہ کہ پرسوں وہ رحلت فرما گئے اور اُن کے سیکڑوں دوستوں اور قدر دانوں کو اس سانحۂ اِرتحال کی خبر تک نہ ہوئی۔ افسوس! اتنا بڑا صاحبِ کمال ہم میں سے اُٹھ جائے اور اُس کی سناؤنی ہم تک نہ پہنچے۔ کتنے بے خبر ہیں ہم لوگ! زندہ قوموں کا یہ شِعار نہیں ہوتا کہ اپنے اہلِ کمال سے غافل ہو جائیں۔ ایسی غفلت مجرمانہ ہوتی ہے۔ شاید یہ ہماری غفلت ہی کی سزا ہے کہ مرزا صاحب کو یوں ایکا ایکی ہم سے چھین لیا گیا۔

عالِم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔ ابھی ہم کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مرزا صاحب کے رخصت ہو جانے سے ہمارا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اب ان کی عدم موجودگی رہ رہ کر ہمیں ان کی یاد دلائے گی اور وقت کے ساتھ اُن کی جدائی کا گھاؤ بڑھتا چلا جائے گا۔ مرزا صاحب بہت ہی خاموش کام کرنے والوں میں سے تھے، یعنی اتنے خاموش کہ خود اُن کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے، کام کرتے تھے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر۔ کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لیے۔ کام کرتے تھے اس لیے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کیے۔ انھوں نے اب سے ۵۵ سال پہلے سر عبدالقادر[1] کے رسالے مخزن میں مضامین لکھے، مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں، بلکہ جب خود اُن کا جی لکھنے کو چاہا۔

۱۔ شیخ سر عبدالقادر، معروف ادیب اور علامہ محمد اقبالؒ کے گہرے دوست تھے۔

مرزا صاحب کسی کو خوش کرنے کے لیے نہیں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب پیسے کے لیے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انھوں نے کبھی پروا نہیں کی، بلکہ پیسے کے ذکر پر وہ چڑ جاتے تھے اور انھیں منانا مشکل ہو جاتا تھا۔ لاہور کے اکثر پبلشروں نے مرزا صاحب سے کتابیں لکھوانی چاہیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کیں مگر مرزا صاحب نے انھیں ایک لفظ بھی لکھ کر نہیں دیا اور جب اپنا پہلا ناول یاسمین لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مُزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسرا ناول خوابِ ہستی لکھا۔ اسے بھی بغیر کچھ لیے دیے چھپوا دیا۔

ایک پبلشر صاحب لاہور سے دِلّی محض اس غرض سے آئے تھے کہ مرزا صاحب سے ناول لکھوائیں گے۔ مَیں نے انھیں سمجھایا کہ مرزا صاحب نہیں لکھیں گے، مگر وہ بڑے بڑے مصنّفوں کو خرید چکے تھے، نہ مانے۔ بولے: ''ہم انھیں ایک ناول کا ایک ہزار روپیا دیں گے تو وہ کیوں نہیں لکھیں گے؟'' یہ وہ زمانہ تھا کہ دو ڈھائی سو روپے میں اچھا خاصا ناول پبلشر کو مل جاتا تھا چناں چہ مجھے اپنے ساتھ لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مَیں نے تعارف کرایا۔ مرزا صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ پبلشر صاحب نے چُھوٹتے ہی ناول لکھنے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ بولے: ''آپ میرے ناول کے پانچ ہزار دے دیں گے، دس ہزار دے دیں گے، مجھے یہ منظور نہیں ہے کہ جو کام کر رہا ہوں، اُسے چھوڑ کر آپ کے لیے ناول لکھوں۔'' پانچ دس ہزار کی بات سن کر پبلشر صاحب کی سِٹّی گم ہوگئی اور دو چار منٹ پہلو بدل کر رُخصت چاہی۔ مرزا صاحب اس زمانے میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب مذہب اور باطنیت لکھ رہے تھے، جسے مکمل ہونے کے بعد ان کے دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی[1] ان سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا صاحب کا صرف یہی ایک علمی کارنامہ ہے، مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو عمدہ کتابیں چھانٹی جائیں تو ان میں مذہب اور باطنیت کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔

مرزا صاحب دِلّی کے شرفا کے ایک متموّل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ترِاہا بیرم خان سے آگے بڑھ کر ایک راستہ سیدھے ہاتھ کو مُڑ جاتا ہے، اسی کے نکّڑ پر مرزا صاحب کا آبائی مکان تھا۔ اسی علاقے میں سرسید احمد خاں[2] کا قدیم مکان بھی تھا۔ سرسید سے بھی مرزا صاحب کی عزیز داری تھی، اور منشی ذکاء اللہ[3] سے بھی ان کی قرابت داری ہوگئی تھی۔ پچاس ساٹھ سال پہلے دلّی کے مسلمان شُرفا میں انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا، مگر سرسیّد نے مسلمانوں کے اس غلط نظریے کی بہت کچھ اصلاح کر دی تھی۔ اسی زمانے میں دِلّی کے دو نوجوانوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے علمی حلقوں میں نمود حاصل کی۔ ایک پروفیسر مشتاق احمد زاہدی تھے اور دوسرے پروفیسر مرزا محمد سعید۔ مرزا صاحب نے اس صدی کے آغاز میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے استادوں میں علّامہ اقبالؒ بھی تھے، جن سے اُن کے مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے کی سند لینے کے بعد مرزا صاحب نے ۷-۱۹۰۶ء میں سال دو سال علی گڑھ میں پڑھایا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں انگریزی کے پروفیسر ہوگئے۔ پنجاب کے بیشتر اعلیٰ عہدے دار مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ پطرس[4] اور تاج[5] نے بھی

۱۔ تاجور نجیب آبادی نامور شاعر اور ادبیات کے عالم تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

۲۔ سرسید احمد خاں مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے علم بردار تھے۔ علی گڑھ میں ایم اے او کالج قائم کیا جو ان کی وفات کے بعد یونیورسٹی بن گیا۔

۳۔ منشی ذکاء اللہ، سرسیّد احمد خاں کے قریبی دوست اور ساتھی تھے۔ تحقیق و تصنیف اور تراجم میں نام پیدا کیا۔

۴۔ پطرس بخاری اردو کے معروف اور بلند پایہ مزاح نگار۔ انگریزی ادبیات کے استاد۔

۵۔ سیّد امتیاز علی تاج ادیب اور ڈراما نویس تھے۔ انار کلی ان کا معروف ڈراما ہے۔

مرزا صاحب سے اکتسابِ علم کیا۔ بعد میں پطرس خود انگریزی کے پروفیسر ہو گئے تھے، مگر اپنی غیر معمولی قابلیت و ذہانت کے باوجود مرزا صاحب کی علمیّت کے آگے اپنے آپ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ مَیں نے بارہا پطرس کو مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے دیکھا ہے۔ پطرس کو مَیں نے کسی اور کا اتنا ادب و احترام کرتے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ وائسرائے ہند کا بھی۔

پطرس کے سلسلے میں دو ایک دل چسپ واقعات یاد آ گئے۔ پطرس آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے تھے، مگر پرانے دوستوں سے رسم و راہ میں ذرا بھی فرق نہ آنے پایا تھا۔ مرزا صاحب کو انھوں نے کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ ریڈیو سے کبھی کبھی تقریر نشر کیا کریں۔ دو ایک تقریروں کے بعد مرزا صاحب نے کانٹریکٹ واپس کرنے شروع کر دیے۔ شُدہ شُدہ بات پطرس تک پہنچی۔ حاضر ہو کر وجہ دریافت کی۔ مرزا صاحب نے فرمایا: ''تمھیں اِصلاح دینے کے بعد مجھے یہ منظور نہیں کہ تمھارے شاگرد مجھے اِصلاح دیں۔'' پطرس نے بڑی معذرت کی، مگر مرزا صاحب آیندہ نشر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اگلے دن دفتر میں قیامت آ گئی۔ پورے اسٹاف کو جمع کر کے انھوں نے براڈ کاسٹنگ کے حسنِ اخلاق پر ایک طویل لکچر دیا۔ بات تو کھل ہی گئی تھی۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے تقریروں کے انچارج کو بلا کر کہا کہ: ''اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو مرزا صاحب کو منا کر لاؤ۔'' اس کو معلوم نہیں تھا کہ مرزا صاحب پطرس کے استاد ہیں۔ حسبِ دستور اپنی کارروائی دکھانے کے لیے اس نے ان کے مسوّدے میں سے دو ایک فقرے نکال دیے تھے۔ ان فقروں کا نکالنا اس کی نوکری سے نکالے جانے کا پیش خیمہ ہو گیا۔ بھاگا مرزا صاحب کی خدمت میں، معافی مانگی، ہاتھ جوڑے، مرزا صاحب نہ مانے، بولا: ''تو حضرت! میری نوکری گئی۔ بال بچے بھوکے مریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔'' مرزا صاحب کے کان کھڑے ہوئے، بولے: ''یہ تو مَیں نہیں چاہتا۔'' اس نے کہا: ''اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو اس کانٹریکٹ پر دستخط کیجیے۔'' مرزا صاحب نے فوراً دستخط کر دیے۔

جنگ کے زمانے میں حُسنِ اتفاق سے دِلّی میں لاہور کے بیشتر ادیب اور شاعر ریڈیو میں یا دوسرے سرکاری محکموں میں جمع ہو گئے تھے۔ پطرس کی تحریک پر ایک محدود ادبی حلقہ قائم کیا گیا، جس میں ڈاکٹر تاثیرؔ [1]، فیض احمد فیضؔ [2]، حامد علی خاں [3]، حمید احمد خاں [4]، چراغ حسن حسرتؔ [5]، محمود نظامی [6]، غلام عباس [7]، انصار ناصری [8] وغیرہ شریک کیے گئے تھے۔ ہر مہینے اس کا ایک جلسہ ہوتا تھا، کبھی پطرس کے گھر پر اور کبھی ڈاکٹر تاثیرؔ کے گھر پر۔ اس میں ایک مقالہ کسی ادبی موضوع پر پڑھا جاتا اور اس پر گفتگو

۱۔ ڈاکٹر تاثیر (پورا نام: محمد دین تاثیر) نامور ادیب اور نقاد تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔

۲۔ فیضؔ معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ زیادہ تر درس و تدریس اور صحافت سے وابستہ رہے۔

۳۔ حامد علی خاں رسالہ ''الحمرا'' کے بانی ایڈیٹر اور ادیب تھے۔

۴۔ حمید احمد خاں ادیب اور نقاد تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

۵۔ حسرتؔ صحافی، ادیب اور مزاح نگار تھے۔

۶۔ محمود نظامی ادیب اور براڈ کاسٹر تھے۔ نظر نامہ ان کا بلند پایہ سفر نامہ ہے۔

۷۔ غلام عباس کا شمار اردو کے بہت اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

۸۔ انصار ناصری ادیب اور براڈ کاسٹر تھے۔

ہوتی۔ ایک جلسے میں محمود نظامی نے مقالہ پڑھا۔ اس میں مرزا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ پطرس خاموش رہے۔ مرزا صاحب سے درخواست کی گئی کہ کچھ فرمائیں۔ مرزا صاحب بحث مباحثے کو ناپسند کرتے تھے، اس لیے بڑی محتاط رائے دیتے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہوتا تھا: ''نہیں یہ بات تو نہیں، مگر خیر ایسا بھی ہوتا ہے۔'' پطرس کو شوخی سوجھی۔ فیض کو اشارہ کیا۔ وہ مرزا صاحب سے زیادہ واقف نہیں تھے، بات کاٹ کر فوراً شروع ہو گئے۔ ''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ رومی تہذیب یونانی تہذیب کے بعد اُبھری؟'' اتنا تو ان کا کہنا اور مرزا صاحب کا جلال میں آ جانا ''جی ہاں، مَیں یہ جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ.....'' پرانی تہذیبوں کی تاریخ کا ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ اس دن مجھے بھی اندازہ ہوا کہ مرزا صاحب کے سینے میں علم کی کتنی دولت بھری پڑی ہے۔ فیض پشیمانی سے بار بار مرزا صاحب کی طرف دیکھتے تھے۔ پطرس دل ہی دل میں ہنس رہے تھے کہ دیکھا اسے کہتے ہیں علم کا سمندر۔ ہم سب دم بخود ساکت بیٹھے مرزا صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ پطرس نے مرزا صاحب کے جلال کو ختم کرنے کے لیے فوراً چائے کا سامان رکھوانا شروع کر دیا اور خدا خدا کر کے مرزا صاحب کا جلال رفع ہوا۔

مرزا صاحب گھنٹوں مطالعہ کرتے تھے۔ اُن کے کُتب خانے میں ہر علم کی کتاب موجود تھی۔ ملازمت درس و تدریس ہی کی تھی، اس لیے نئی سے نئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ''اگر مَیں اتنا مطالعہ نہ کروں تو ان انگریز پروفیسروں کے آگے کیسے ٹھہر سکتا ہوں؟'' پنشن لینے کے بعد بھی اُن کا واحد مشغلہ مطالعۂ کُتب ہی رہا۔ ان کا یہ شغل اب تک جاری تھا۔ پنشن کا بڑا حصہ کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی۔ کرّ و فر یا ٹھاٹ باٹ سے کبھی نہیں رہے۔ گھر کی سواری ہم نے ان کے پاس کبھی نہیں دیکھی۔ معدے کے مریض تھے۔ پیدل زیادہ چلتے تھے۔ صبح ٹہلنے ضرور جاتے تھے۔ رات کو جلدی سو جاتے تھے۔ کھیل، تماشے، سینما، تھیٹر کچھ نہیں دیکھتے تھے۔ خدا کے فضل سے گھر کا آرام انھیں میسر تھا۔ اُن کی بیگم بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ دو ایک ناول ان کے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اولاد سعادت مند، بیوی سلیقہ شعار، پنشن اتنی کہ بڑھاپے میں کسی کی محتاجی نہیں۔ کھانا سادہ، لباس سادہ، رہن سہن سادہ، پھر احتیاج ہو تو کس بات کی؟ قَلْبٍ مُطْمَئِنَّہ کی دولت سے مالا مال تھے۔

ریڈیو پاکستان کراچی سے ۱۲ سال پہلے ایک پروگرام ''دانش کدہ'' شروع کیا گیا تھا، جس میں چار دانش ور بلائے جاتے تھے اور سننے والوں کے سوالوں کے جواب فی البدیہہ دیا کرتے تھے۔ مَیں میر سوالات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مرزا صاحب اگر اس پروگرام میں شرکت فرمانا منظور کر لیں تو اس پروگرام کو چار چاند لگ جائیں چناں چہ مَیں مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرضِ مدّعا سن کر متبسّم ہوئے۔ فرمایا: ''آدمی شہرت کے لیے کوئی کام کرتا ہے یا دولت کے لیے۔ مجھے نہ اس کی ضروت ہے، نہ اُس کی۔'' مَیں نے قُدری کر لی، مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مرزا صاحب بہت قاعدے قرینے کے آدمی تھے، جو کہہ دیتے، اس سے نہ پھرتے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب مسلم لیگ نے زور پکڑا تو مرزا صاحب نے سیاست میں بھی حِصّہ لینا شروع کر دیا اور صوبائی

مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور مسلم لیگ کاؤنسل کے ممبر بھی چنے گئے۔ کراچی یونی ورسٹی قائم ہوئی تو اس کے مشیر مقرر ہوئے اور جب پاکستانی ادیبوں کا گلڈ ۱۹۵۹ء میں بنایا گیا تو مرزا صاحب ہی نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مرزا صاحب بظاہر علیل نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اِکہرا ڈیل، اُجلا رنگ، کُشادہ پیشانی، گھنی بھنوؤں کے سائے میں بڑی بڑی روشن آنکھیں، رُخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، کترواں مونچھیں، ہنستے تو سامنے کے دو چار دانت ٹوٹے ہوئے نظر آتے، مگر بُرے نہ لگتے تھے۔ ڈاڑھی مُنڈی ہوئی۔ دھان پان سے آدمی تھے۔ ۳۰ء میں جب مَیں نے انھیں پہلی دفعہ دیکھا تو ان کی عمر ۴۴-۴۵ سال کی تھی۔ ۶۲ء میں جب وہ ۷۶ سال کے تھے، تب بھی وہ ویسے کے ویسے ہی تھے۔ انھیں زمانے کا شکوہ یا صحت کی شکایت کرتے کبھی نہیں سنا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ سنا ہے کہ دِلّی کے جن دو چار نوجوانوں نے سب سے پہلے سوٹ پہننا شروع کیا، ان میں سب سے نفیس سوٹ مرزا صاحب ہی کا ہوتا تھا، مگر مَیں نے پچھلے ۳۲ سال میں انھیں ہمیشہ شیروانی ہی پہنے دیکھا۔ انگریزی ان کا اوڑھنا بچھونا مگر رعب گانٹھنے کے لیے کبھی انگریزی میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ بالکل نہیں آنے پاتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ان کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا، اس لیے لکھنے میں انھیں زحمت ہوتی تھی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج آدمی تھے مگر زیادہ دوست بنانے کے قائل نہیں تھے۔ آپ بھلے اور اپنا گھر بھلا۔

موت برحق ہے۔ مرنا سب کو ہے مگر مرنے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے خاصی عمر پائی مگر ان کی وفات کا صدمہ اس لیے زیادہ ہے کہ ایسے قابل، ایسے شریف اور ایسے وضع دار لوگ زمانہ اب پیدا نہیں کرے گا۔ افسوس کہ پروفیسر مرزا محمد سعید اب وہاں ہیں، جہاں ہماری نیک آرزوئیں رہتی ہیں۔ ایسی جامعُ العلوم ہستی سے محروم ہونے کا ہمیں جتنا بھی غم ہو، کم ہے:

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

(گنجینۂ گوہر)

☆☆☆☆

مشق

۱۔ درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کیجیے:

(الف) مرزا محمد سعید کس لیے لکھتے تھے؟

(ب) لاہور کے پبلشروں کے ساتھ مرزا صاحب کا رویّہ کیسا تھا؟

(ج) مرزا صاحب کی معرکتہ الآرا کتاب کا نام اور مرتبہ بیان کیجیے۔

(د) مرزا صاحب کی کن دو قومی شخصیات سے عزیز داری تھی؟

(ہ) مرزا صاحب نے کس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے؟

(و) مرزا صاحب کا سب سے بڑا مشغلہ کیا تھا؟

(ز) مصنف کے پروگرام ''دانش کدہ'' میں شرکت کی درخواست پر مرزا صاحب نے کیا جواب دیا؟

(ح) مرزا محمد سعید کا حلیہ بیان کیجیے۔

(ط) مرزا صاحب کے دونوں ناولوں کے نام تحریر کریں۔

۲۔ پطرس بخاری سے مرزا صاحب کے تعلق کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۳۔ ''عالم کی موت عالَم کی موت ہوتی ہے۔'' اس جملے کا مفہوم وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

۴۔ متن کی روشنی میں درست جواب پر نشان (✓) لگائیے:

(الف) سبق ''مرزا محمد سعید'' کس ادیب کی تحریر ہے؟

(i) نذیر احمد دہلوی (ii) شاہد احمد دہلوی

(iii) اشرف صبوحی (iv) مولوی عبدالحق

(ب) مرزا محمد سعید کی عزیز داری کس شخصیت سے تھی؟

(i) سرسیّد احمد خاں (ii) شیخ عبدالقادر

(iii) شاہد احمد دہلوی (iv) مشتاق احمد زاہدی

(ج) مرزا محمد سعید کے بقول انسان کس لیے کام کرتا ہے؟

(i) شہرت (ii) دولت

(iii) عزت اور وقار (iv) شہرت اور دولت

(د) مرزا محمد سعید نے گورنمنٹ کالج لاہور سے کون سی سند لی؟

(i) بی۔اے (ii) ایم۔اے تاریخ

(iii) ایم۔اے انگریزی ادب (iv) ایم۔اے اردو ادب

(ہ) محمود نظامی کے مقالے کے بعد مرزا محمد سعید پر کس نے تنقید کی؟

(i) ڈاکٹر تاثیر (ii) پطرس بخاری

(iii) فیض احمد فیض (iv) حمید احمد خاں

(و) پروگرام ''دانش کدہ'' میں کتنے دانشور بلائے جاتے تھے؟

(i) چار (ii) تین

(iii) دو (iv) سات

(ز) مرزا صاحب پنشن کا بڑا حصّہ صرف کر دیتے تھے:

(i) جائیداد خریدنے پر (ii) خیرات کرنے میں

(iii) کتابوں پر (iv) کھانے پینے پر

۵۔ درجِ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت جملوں میں استعمال کے ذریعے کیجیے:

سانحۂ ارتحال، سُناؤنی، ایکا ایکی، بے مُزد، متمول، قرابت داری، ہیچ سمجھنا، شُدہ شُدہ، کرّ وفَر، قلبِ مُطمئنّہ، عرضِ مدّعا، متبسّم، رَعشہ، جامعُ العلوم۔

۶۔ درجِ ذیل الفاظ پر اِعراب لگا کر، ان کا تلفظ واضح کیجیے:

ارتحال، شعار، متمول، ساکت، مباحثے، متبسم، قدری، رعشہ

۷۔ سبق ''مرزا محمد سعید'' کا متن ذہن میں رکھ کر درست یا غلط پر نشان (√) لگائیں:

(الف) مرزا محمد سعید کی موت کی خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ درست/ غلط

(ب) مرزا صاحب پبلک پلیٹ فارم پر آنے سے گھبراتے نہیں تھے۔ درست/ غلط

(ج) مرزا صاحب بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ درست/ غلط

(د) مرزا صاحب جو کہ دیتے اس سے کبھی نہ پھرتے۔ درست/ غلط

(ہ) مرزا محمد سعید دل کے مریض تھے۔ درست/ غلط

جملہ اِسمیہ اور جملہ فعلیہ:

۱۔ جملہ اِسمیہ

جملہ اِسمیہ جملہ خبریہ کی قسم ہے، اس کے تین اجزا ہوتے ہیں۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے:

۱۔ علی بہادر ہے۔

۲۔ سارہ لائق ہے۔

۳۔ صہیب خوش ہے۔

ان جملوں میں علی، سارہ اور صہیب کو ''مُسند الیہ'' (مُبتدا) کہتے ہیں اور بہادر، لائق اور خوش ''مُسند'' (خبر) ہیں جب کہ ''ہے'' فعلِ ناقِص ہے۔

۲۔ جملہ فعلیہ

جملہ فعلیہ بھی جملہ خبریہ کی قسم ہے۔ اس میں اور جملہ اِسمیہ میں اتنا فرق ہے کہ جملہ فعلیہ میں فعلِ تام ہوتا ہے۔ اب ذیل کے جملوں کو پڑھیے:

۱۔ حمید نے خط لکھا۔

۲۔ فریحہ نے خیرات دی۔

۳۔ شعیب نے کھانا کھایا۔

ان جملوں میں حمید، فریحہ اور شعیب ''مسندالیہ'' ہیں اور لکھا، دی اور کھایا فعلِ تام یا ''مسند'' ہیں۔ یہ خبر دے رہے ہیں۔
خط، خیرات اور کھانا مفعول ہیں۔
یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ کسی جملے میں کسی کے بارے میں کچھ کہا جائے تو وہ خبر ہوتی ہے اور اسے مسند کہتے ہیں۔
جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ خبر کے بغیر درست نہیں ہوتے۔

خاکہ

کسی شخص کی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو اس طرح نمایاں کرنا کہ اس کا تعارف بھی ہو جائے مگر وہ اس کی سوانح نہ ہو، خاکہ کہلاتا ہے۔ خاکے میں اس شخص کے افکار و کردار، خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اردو میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل نے عمدہ خاکے لکھے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ سبق سے محاورات الگ کریں اور ان کو جملوں میں استعمال کریں۔
۲۔ مرزا محمد سعید کی شخصی خوبیوں پر ایک پیراگراف لکھیں۔
۳۔ اس سبق میں جن شخصیات کا ذکر آیا ہے، ان میں سے کسی ایک کے بارے میں استاد سے پوچھ کر نوٹ لکھیں۔
۴۔ کسی دوست کا مختصر خاکہ لکھیں۔

اساتذہ کرام کے لیے

۱۔ چند مثالیں دے کر دِلّی کی مخصوص زبان سے طلبہ کو روشناس کرایا جائے۔
۲۔ طلبہ کو مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر ''مولوی نذیر احمد کی کہانی'' اور شاہد احمد دہلوی کا لکھا ہوا خاکہ ''نذیر احمد دہلوی'' پڑھ کر سنایا جائے۔ یہ خاکے نصابی کتابوں میں دستیاب ہیں، اس سے طلبہ کی کردار سازی میں مدد ملتی ہے اور صنفِ ادب سے بھی اچھی طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔
۳۔ طلبہ کو گاہے گاہے مشاہیر سے واقفیت دلائی جائے۔

☆☆☆